مولانا عبدالحی فاروقی ایم اے

شاہ ولی اللہؒ کا نظریہ تصوّف

یہ مقالہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
نئی دھلی کے سیرچ فورم میں پڑھا گیا تھا

سترھویں صدی کی آخری دہائیاں چل رہی تھیں مغل سلطنت اپنے عروج کے بعد ایک ٹھہراؤ کے مقام پر آ چکی تھی۔ مذہبی اعتبار سے ہندوستان کے لئے یہ زمانہ نہایت سعید اور سازگار تھا۔ سرزمین ہند عمومی طور پر اور دہلی و اس کے آس پاس کا علاقہ خصوصی طور پر مقابر اور مجاذیب سے منور تھا۔ انہیں نفوس قدسیہ میں سے ایک شخصیت شاہ عبدالرحیمؒ کے نام سے ابھرتی ہے جن کو ساٹھ سال کی عمر میں غیبی طور پر عقد ثانی کا حکم ملتا ہے۔ اور بشارتیں ملنے لگتی ہیں کہ تم کو ایک بلند اقبال اور ہونہار بچے سے نوازا جائے گا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ روحانی طور پر انہیں اطلاع دیتے ہیں کہ عنقریب تمہارے یہاں ایک بچہ پیدا ہوگا جب نام میرے نام پر رکھنا۔ غرض ان اشارات کے بموجب شاہ عبدالرحیم نے دوسرا عقد کیا جس سے ۱۰ر فروری ۱۷۰۳ء کو صبح صادق کے وقت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی پیدا ہوئے۔ نام آپ کا قطب الدین احمد، تاریخی عظیم الدین اور کنیت ابوالفیاض تھی۔ لیکن شہرت و مقبولیت ولی اللہ کے نام سے ہوئی۔ اس بچے کی عظمت کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ابھی آپ ماں کی آغوش ہی میں تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب پرندہ شاہ عبدالرحیم کے پاس آیا جس کے دہن میں ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لوکان النبوۃ بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ممکنا لجعلناك نبیا ولکنہا انقطعت بہ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اگر نبوت ممکن ہوتی تو ہم آپ کو نبی بنا دیتے لیکن اب وہ منقطع ہے۔ تفہیمات ج ۲

شاہ عبدالرحیم نے اس بشارت کی یہ تعبیر دی کہ یہ شیر خوار بچہ آگے چل کر ولی کامل ہوگا۔

شیر خوارگی کا یہ زمانہ ختم ہوا لڑکپن کا دور آیا۔ اس وقت بھی آپ شرافت و متانت کے پیکر تھے۔ ہمیشہ سنجیدہ، سادہ اور پر وقار نظر آتے تھے۔ فطرۃً کھیل کود کی طرف کبھی طبیعت مائل نہ تھی۔

جب آپ نے عمر کی پانچویں منزل میں قدم رکھا تو آپ کے والد نے تعلیم کا سلسلہ شروع کرادیا۔ سات سال کے ہوئے تو حافظ قرآن ہوگئے۔ اور فارسی کا مروجہ نصاب بھی مکمل کرلیا۔ اسی سال آپ کو پہلا روزہ بھی رکھوایا گیا تھا۔ اس کے بعد عربی کی تعلیم شروع کرائی گئی دس سال کی عمر میں آپ شرح جامی جیسی کتاب کے طالب علم تھے۔ یہاں تک کہ پندرہ سال کی عمر میں درسیات سے فراغت حاصل کرلی۔ اسی سال والد محترم شاہ عبدالرحیم نے آپ کو اپنی بیعت میں لے لیا۔ اور اوراد و وظائف کی مشق شروع کرادی۔ آپ کی یہ پہلی اور بنیادی بیعت سلسلہ نقشبندیہ میں ہوئی تھی۔ اور آپ نے اسی میں سلوک کے پورے منازل طے کرلیے تھے۔

شاہ عبدالرحیم چونکہ خود بھی ایک مجتہد فن تھے اور باطنی فیض سے مالامال تھے۔ اس لئے ان کی خصوصی توجہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف ہمیشہ مبذول رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے آداب طریقت کی تعلیم کچھ اس نہج پہ فرمائی کہ شاہ صاحب بہت جلد اپنی باطنی نسبت درست کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

تعلیم اور سلوک طے کرنے کے بعد شاہ صاحب نے مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کردیا۔ جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم پہلے ہی ڈال چکے تھے۔ یہ مدرسہ ٹھیک اسی جگہ پر واقع تھا جہاں آج نئی دہلی میں مولانا آزاد میڈیکل کالج کی عمارت ہے۔ جس کی پشت پر محلہ "مہندیان" واقع ہے۔ اب آج اسی مہندیان میں شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان تاقیام قیامت آسودۂ رحمت ہے۔

مسلسل بارہ سال تک آپ اس مدرسہ میں درس دیتے رہے۔ تدریس کی اس مدت میں آپ نے معقولات و منقولات میں ہر قسم کی کتابیں پڑھائیں اور ہر علم میں آپ کو غور و فکر اور تدبر و تامل کا موقع ملا۔

بارہ سال درس دینے کے بعد آپ حج و زیارت کے لئے حجاز تشریف لے گئے۔ یہ زمانہ ۱۱۴۳ھ کا تھا۔ چودہ مہینے ارض مقدس میں قیام کرکے رجب ۱۱۴۵ھ میں دہلی واپس آئے۔ حجاز مقدس میں آپ نے دوسرے مشائخ و علماء کے علاوہ آپ کی ملاقات شیخ ابوطاہر کردی سے ہوئی جن سے خاص طور پر حدیث کی روایت کا موقع ملا۔ یہی شیخ ابوطاہر کردی آپ کے استاد حدیث بھی تھے۔ اور انہی سے آپ کو بیشتر سلسلوں میں بیعت و خلافت کی حاصل ہوئی تھی۔ شاہ صاحب کی علمی سرگرمیوں اور دینی خدمات کے نقطۂ نظر سے یہ سفر حرمین نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کو اسی سفر میں آئندہ تجدیدی کارناموں کی بنیاد رکھنے کے لئے دربار رسالتؐ سے روحانی طور پر ایک مکمل اور مربوط پروگرام عطا کیا گیا تھا۔ جسے آپ نے ہندوستان واپس آکر عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

سفر حرمین سے واپسی کے چند روز بعد ہی آپ نے سلسلہ درس و تدریس پھر شروع کردیا جس سے مدرسہ رحیمیہ نے ایک بار پھر مرکزی حیثیت حاصل کرلی۔ اس مرتبہ طلباء کی اتنی کثرت اور اتنا ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں جگہ کی قلت و تنگی محسوس ہونے لگی جس کو دیکھ کر ایک دنیادار بادشاہ جس کو تاریخ ہند ایک شرابی، عیاش، بے فکر اور آرام طلب

جیسے ناموں سے یاد کرتی ہے یعنی مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا نے شاہ جہاں آباد کے اندر کوچہ فولاد خاں کے عقب کلاں محل میں ایک وسیع و عریض محل سرا شاہ صاحب کے مدرسہ کے لئے وقف کر دی اسی محل سرا سے علم حدیث فقہ و تفسیر، تصوف اور اسرار حکم کے وہ سوتے پھوٹے جس نے نہ صرف سرزمین ہند بلکہ بیرون ہند کو بھی سیراب و مالا مال کر دیا۔ یہی محل سرا شاہ صاحب کے انقلابی پیروکاروں کے لئے ایک پلیٹ فارم بنی۔

یہیں سے احمد شاہ ابدالی کو پانی پت کے فیصلہ کن معرکہ کے لئے دعوت دی گئی۔ یہیں سے جاٹوں اور مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے مدافعت کی گئی۔ یہیں سے نادر شاہی افواج کے ظلم و ستم کی خونچکاں داستان کا ورق الٹا گیا۔

میرا وجدان کہتا ہے کہ چاہے دنیا کچھ بھی کہے مگر محمد شاہ رنگیلے کی ساری میخواریاں، ساری عیاشیاں اور اس کی ساری عیش کوشیاں ایک طرف اور شاہ صاحبؒ کے مدرسہ کے لئے اس کا یہ عطیہ دوسری طرف یقیناً تنہا یہی اس کی مغفرت کے لئے کافی ہے۔ یہ اسی کا تو زمانہ تھا کہ بقول شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اسی دہلی شہر میں بیک وقت ۲۲ اولیا و مشائخ موجود تھے۔ چنانچہ اسی زمانہ سے دہلی "۲۲ خواجہ کی چوکھٹ" کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنی زندگی میں مغل تخت حکومت پر اورنگ زیبؒ سے لے کر شاہ عالم تک گیارہ بادشاہوں کو اترتے چڑھتے دیکھا تھا۔ آج ایک ہے تو کل دوسرا۔ آج اس کی گردن اڑی تو کل دوسرے کو معزول کیا گیا۔ غرض کہ ایک افراتفری کا زمانہ تھا۔ ملک کی ہر مالی طاقت دہلی کو تہس نہس کر دیتی تھی۔ اٹھارہویں صدی ملک کی تاریخ میں انتشار و اضطراب اور بے چینی و بدامنی کی علامت بن گئی تھی۔ ان نامساعد حالات میں اسی دہلی کے اندر شاہ ولی اللہ اپنی مسند درس بچھائے علوم و معرفت کے دریا بہا رہے تھے۔

شاہ صاحب کی ساری تصانیف جن میں سے اب تو بعض کے صرف نام ہی کتابوں میں ملتے ہیں ان کی مجموعی تعداد لگ بھگ ستر کے قریب ہے۔ یہ تصنیفات مختلف علوم پر حاوی ہیں۔ ان تصنیفات میں تیرہ سے زائد وہ رسالے اور کتابیں ہیں جو خالص تصوف سے متعلق ہیں۔ جن میں القول الجمیل۔ فیوض الحرمین۔ الخیر الکثیر۔ البدور البازغہ۔ تفہیمات الٰہیہ۔ الطاف القدس۔ سطعات۔ اور ہمعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

میں نے اس وقت شاہ صاحب کی ان دوسری تصانیف کا ذکر قصداً نہیں کیا ہے جو تصوف سے خصوصی طور پر متعلق نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان خدمات کا جلیلہ کا تذکرہ کیا ہے۔ جو ان کے مجدد مصلح اور حکیم الامت ہونے پر دال ہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت ہمارے موضوع بحث سے باہر ہیں۔ ورنہ حدیث و تفسیر فقہ و کلام پر جو ان کے نوادرات ہیں یا جو ان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور دینی خدمات ہیں اگر ان پر کچھ لکھا جائے تو ہر موضوع پر مستقل الگ ایک کتاب لکھنا ہوگی۔

آپ نے عمر کے آخری حصہ میں مدرسہ رحیمیہ کی تدریسی ذمہ داریاں اپنے مخصوص تلامذہ کے سپرد کر دی تھیں اور خود مسترشدین و متوسلین کی بیعت و ارشاد میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں آپ بڈھانہ ضلع مظفر نگر یو۔ پی

ہیں قیام پذیر تھے اسی دوران مرض الموت میں گرفتار ہوئے اور علاج کے لئے دہلی لائے گئے۔ لیکن زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ بالآخر ۲ اگست ۱۷۶۲ عیسوی کو ظہر کے وقت اکسٹھ سال ۴ ماہ کی عمر میں انتقال فرمایا۔ اور دہلی شہر پناہ کے باہر اپنے قدیم مدرسہ رحیمیہ میں جو اب " مہندیاں" کہلاتا ہے سپرد رحمت کئے گئے۔

حضرت شاہ صاحب کے نظریات تصوف | تصوف کے نام سے جو اصطلاح آج کل علمی دنیا میں رائج ہے وہ آغاز اسلام میں نہ تھی۔ یہ اصطلاح بہت بعد کی پیداوار ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق یہ لفظ تیو صوفی سے نکلا ہے۔ جو اصلاً یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی علم الٰہی یا علم معرفت کے ہیں لفظ تصوف کے ہم معنی ہے۔ صوفی اسی سے بنا ہے جس کے معنی عارف کے ہیں۔ (مسئلہ وحدت الوجود" مؤلفہ مولوی صفوۃ الرحمٰن ص۱۶) لیکن زیادہ تر صوفیا کا خیال یہ ہے کہ لفظ صوفی، صُوف سے مشتق ہے بالخصوص شیخ ابو نصر سراجؒ فرماتے ہیں:-

"صوفیا اپنے ظاہری لباس کی وجہ سے صوفی کہلاتے کیونکہ بھیڑوں کے اون کے کپڑے پہننا انبیاء، اولیاء اور برگزیدہ ہستیوں کا خاص نشان ہے۔" (تاریخ مشائخ چشت ص۱۵)

عہد نبوی اور عہد صحابہ میں تصوف کو احسان کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ احسان کسے کہتے ہیں اس کی تعریف خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں کی ہے۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

تم اس طرح اللہ کی عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

یہ ہے وہ احسان جو آگے چل کر مسلمانوں میں تصوف کے نام سے رواج پذیر ہوا۔

مذکورہ بالا حدیث نبوی پر بحث کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی صاحب نے بھی اپنی رائے ظاہر کی ہے کہ حقیقی تصوف یہی ہے (حجۃ اللہ البالغہ) ایک دوسری جگہ اپنی کتاب ہمعات میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

"دین اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک ظاہری دوسری باطنی، اسلام کی ظاہری حیثیت کا تعلق تو ان احکام و اعمال سے ہے جن سے فرد اور جماعت کی خارجی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ اسی کو ہم شریعت کہتے ہیں۔ نیکی اور طاعت سے انسان کے دل میں جو معنوی کیفیات پیدا ہوتی ہیں ان کو ہم طریقت کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

اس طرح شاہ صاحبؒ دین کی اس باطنی حیثیت کو احسان کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں آپ جس طرح تفسیر و فقہ اور علم حدیث کے امام تھے۔ اسی طرح تصوف کے بھی امام تھے۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں چاروں طرف اسی کا چرچا تھا بالخصوص آپ کا خاندان تو اس خاص فن میں ایک امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کے دادا شاہ وجیہہ الدین۔ آپ کے والد

شاہ عبدالرحیمؒ اور آپ کے چچا شاہ ابورضاؒ اپنے وقت کے زہاد اور عباد میں شمار کئے جاتے ہیں۔

سلسلۂ تصوف | شاہ صاحب ظاہری تعلیم کے ساتھ باطنی تعلیم بھی اپنے والد شاہ عبدالرحیمؒ سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے آپ کو سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کرکے خلافت سے سرفراز فرمایا تھا پھر آپ حجاز تشریف لے گئے جہاں شیخ ابوطاہر کردیؒ سے بیعت ہوکر خرقہ و خلافت حاصل کیا جو تمام سلسلوں کا جامع تھا۔

فن تصوف کی معروف کتاب ہمعات میں آپ نے صوفیاء کے تمام خانوادوں کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اللہ پاک نے مجھے تمام گذشتہ خانوادوں سے یا ان میں اکثر سے ربط و تعلق عطا فرمایا ہے۔

اسی طرح الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ میں ارشاد فرماتے ہیں :۔

"آج روئے زمین پر جتنے بھی تصوف و سلوک کے خانوادے موجود و مشہور ہیں ان سب سے یا اکثر سے مجھے ارتباط حاصل ہے۔ اور پھر ان سب سے مجھے بیعت، صحبت، خرقہ اور اجازت بھی حاصل ہوچکی ہے۔"

شاہ صاحب کو جن خانوادوں سے بیعت و اجازت حاصل تھی ان میں سے چند یہ ہیں :۔

نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ، مشترعیہ، مجددیہ، جنوریہ، خضرویہ، اکبریہ، ابوالعلائیہ، نوریہ، معصومیہ جامیہ نظامیہ، سراجیہ، قدوسیہ، صابریہ، کبرویہ، ہمدانیہ، عیدروسیہ، شاذلیہ، شطاریہ اور مداریہ وغیرہ۔

لیکن میرے نزدیک ان تمام خانوادوں اور سلسلوں کے مقابلہ میں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ حضرت شاہ صاحبؒ اویسی المشرب تھے یعنی آپ کو براہ راست بارگاہ نبوت سے رشد و ہدایت، رہنمائی اور شاگردی حاصل تھی۔ لہذا فیوض الحرمین میں ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

"مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس خود سلوک کا راستہ طے کرایا ہے اور خود اپنے دست مبارک سے میری تربیت فرمائی ہے۔ لہذا میں اویسی اور آپ کا بلاواسطہ شاگرد ہوں۔"

یہ خصوصیت شاذ و نادر ہی کسی کو حاصل ہوتی ہے۔ ذات نبویؐ سے براہ راست ذکر و اذکار اور سلوک کی تعلیم ہندوستانی علماء و صوفیاء میں صرف چند ہی کو حاصل ہوئی ہے جن میں سے ایک امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی بھی تھے۔

حضرت شاہ صاحب نے اپنی تصنیفات میں متعدد جگہوں پر اور فیوض الحرمین میں خاص طور سے کئی مقامات پر تحریر کیا ہے کہ مجھے جب بھی کوئی علمی یا روحانی دشواری پیش آتی ہے تو میں فوراً روح نبویؐ کی جانب متوجہ ہوتا ہوں آپ کی روح پاک مجھے ڈھانک لیتی ہے۔ اور میری استعانت فرماتی ہے جس سے میری دشواریوں کا حل نکل آتا ہے۔

جب سالک روحانی طور پر اتنے اعلیٰ مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی مخصوص سلسلہ یا خانوادے کا پابند نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا خود ایک سلسلہ اور مسلک بن جاتا ہے جو دوسروں کے لئے چراغ راہ کا کام دیتا ہے۔

شاہ صاحب تصوف کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ آپ یہ محسوس کرتے تھے کہ دین و شریعت بغیر احسان و اخلاص کے ایک جسم بے روح کے مثل ہے۔ اس سے علیحدگی اختیار کرنا دین شریعت کو ایک سیاسی تحریک بنا لینے کے مترادف ہوگا۔

شریعت و طریقت | آپ کے زمانے میں شریعت و طریقت کی دو جداگانہ اصطلاحیں بڑے زور و شور سے رائج تھیں علماء ظاہر اور صوفیائے خام دونوں باہم دست و گریبان تھے۔ یہ علمائے خشک اور بے جان بحثوں میں الجھے، فلسفہ اور منطق کی گتھیاں سلجھاتے، ادب میں معانی و بیان کی گھاٹیوں کو طے کرتے اور دنیائے شعر و سخن میں عروض و قوافی کی موشگافیوں میں مبتلا تھے۔ کہیں آمین بالجہر کا قصہ تھا۔ کہیں ناسخ و منسوخ کی بحثیں تھیں۔ کہیں ناسخ و منسوخ کی بحثیں تھیں۔ کہیں خلافت و امامت کا چرچا۔ کہیں امام بخاری پر لے دے۔ کبھی ابن تیمیہ پر لعن طعن، کوئی ملا صدرہ اور میر باقر داماد کا معترف تو کوئی توضیح و تلویح، شرح عقائد و خیالی کا دلدادہ تھا۔ غرض کہ ان کا دماغ تو روشن تھا مگر اکثروں کے دل ویران اور سوز و گداز سے خالی تھے۔ معاشرے میں ایک طرف تو یہ لوگ تھے۔ دوسری طرف صوفیائے خام اور جاہل پیروں کا تسلط تھا۔ سجادگی کے جھگڑے، سماع کے جواز اور عدم جواز کی بحثیں، تعویذ، گنڈوں اور ٹونے ٹوٹکوں کی حکمرانیاں تھیں۔ عشق حقیقی کی تلاش مجاز کے حسین و نوخیز چہروں میں کی جاتی تھی۔ اپنے اکابر اور اسلاف کے طریقہ کو بجائے روحانیت حاصل کرنے کے روزی روٹی کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ غرض کہ پورا معاشرہ مضطرب و بے چین اور دو متضاد گروہوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طریقت کا نام لیوا دوسرا شریعت کا۔ دونوں ایک دوسرے کے درپے آزار تھے۔

تجدیدی کارنامہ | یہ تھا وہ ماحول جس میں شاہ صاحب نے آنکھ کھولی۔ آپ نے دونوں گروہوں کو للکارا اور متنبہ کیا۔ چنانچہ آپ نے نہ تو جادۂ شریعت سے قدم ہٹانا گوارہ کیا اور نہ ہی تصوف کو چھوڑنا پسند کیا۔ آپ نے شریعت اور طریقت کو باہم جمع کرنے کی کوشش کی اور یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی مثال شاہ صاحب سے پہلے اور کہیں نہیں ملتی۔

تصوف میں شاہ صاحب کا یہ تجدیدی کارنامہ اس طرح ہے کہ عام طور پر صوفیائے کرام تصوف کی بنیاد لطائف ثلاثہ کو قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے بدن میں تین خاص اعضاء ہیں۔ دماغ، قلب اور کبد جنہیں اطباء کی اصطلاح میں اعضاء رئیسہ کہا جاتا ہے۔ انہیں اعضاء کی مرکزی قوتوں کو تصوف کی زبان میں بالترتیب لطیفہ عقل لطیفہ قلب اور لطیفہ نفس کہا جاتا ہے۔ پھر ان کی آپس میں ترکیب و تحلیل سے مزید مقامات پیدا ہوتے ہیں۔ عرصہ دراز سے صوفیاء کی طرز فکر کی بنیاد انہی لطائف ثلاثہ پر چلی آرہی ہے لہذا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم شریعت اور

راہ طریقت دو الگ الگ چیزیں بن گئیں۔

ان دونوں کے بارے میں دو جداگانہ حقیقتوں کا وہم ہونے لگا۔ چنانچہ یہ نظریہ قائم ہو گیا کہ شریعت علیحدہ شئے ہے اور طریقت علیحدہ شئے ہے۔ صوفیا رخام نے شریعت کو غیر ضروری قرار دیا اور علماء ظاہر نے تصوف کو بے کار اور لایعنی چیز گردانا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے ان ساری باتوں پر نظر ڈالی۔ انہوں نے دیکھا کہ ایمان بالآخرت صوفیا کرام ہی کی صحبتوں میں کامل اور مکمل ہوتا ہے۔ نیز ان کے سامنے یہ حقیقت بھی آئی کہ ایمان باللہ بغیر عقیدہ آخرت کے کوئی حیثیت نہیں رکھتا ایسی توحید جس کے ساتھ آخرت کا کوئی واضح تصور نہ ہو ہرگز معتبر نہیں۔ شاہ صاحب نے اس گتھی کو یوں سلجھایا کہ نہ صرف سارے اعتراضات ہی رفع ہو جاتے ہیں بلکہ ان دونوں میں یگانگت پیدا ہو جاتی۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک درخت کے دو پھل ہیں۔

شریعت و طریقت میں تطبیق کرنے کے لئے شاہ صاحبؒ نے مذکورہ بالا تین لطائف کے علاوہ ایک چوتھا لطیفہ "لطیفہ جوارح" کے نام سے مزید اضافہ کیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لطائف دو رخ رکھتے ہیں۔ ایک رخ ظاہری اعضاء و جوارح کی طرف ہوتا ہے۔ اور دوسرا رخ اپنے منبع و سرچشمہ کی طرف ہوتا ہے۔ پہلے کو مکمل کرنے اور اپنانے کا نام شریعت ہے اور دوسرے کو تکمیل دینے کا نام احسان یا طریقت ہے۔ اب اس انداز فکر سے شریعت و طریقت اپنی اصل کے اعتبار سے دو مختلف چیزیں نہیں رکھتیں۔ یہی شاہ صاحبؒ کا تجدیدی کارنامہ ہے۔

نظریۂ وحدت | دوسرا موضوع جو شاہ صاحب کے زمانے میں زیر بحث تھا وہ تھا وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مسئلہ، صوفیا کرام مسئلہ توحید باری میں دو مختلف نظریات رکھتے تھے جن کی تعبیر لفظی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سے کی جاتی تھی۔

اول الذکر نظریہ شیخ محی الدین ابن العربیؒ کی طرف اور دوسرا شیخ احمد سرہندیؒ کی جانب منسوب تھا۔

شیخ محی الدین العربیؒ کا نظریہ ہندوستان میں صوفیاء کرام کا عام مسلک تھا۔ دراصل صوفیا کو اس ملک میں جن اقوام سے قریب تر لانے کے لئے یہی نظریہ بڑا مؤثر ذریعہ تھا۔ لیکن وحدۃ الوجود کی غلط عملی تعبیر سے اکبر کے عہد میں بے اعتدالیاں پیدا ہونے لگیں اور بد قسمتی سے شریعت اور شعائر اسلامی کا استہزاء درباری مسلک میں داخل ہو گیا چنانچہ امام ربانی شیخ احمد سرہندیؒ اس کی اصلاح کے لئے اٹھے۔ انہوں نے اس کے بالمقابل وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا۔ ان کے گردوپیش کے حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ سے امت کو ہٹا کر وحدۃ الشہود کے نظریہ پر کاربند کیا جائے۔ کیونکہ ملت اسلامیہ میں جن عقائد و خیالات کو فروغ ہو رہا تھا اس کے لئے ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود کی غلط توجیہہ غذا کا کام دے رہی تھی۔

شیخ اکبر کے نظریہ وحدۃ الوجود امام ربانی کے وحدۃ الشہود اور شاہ ولی اللہ کی ان دونوں میں تطبیق کو مختصر الفاظ میں سمجھانے کے لئے سر احمد حسین سولف " فلسفہ رفقرا " کا یہ اقتباس پیش خدمت ہے۔

" ابن عربی نے علم کے ذریعہ توحید باری کو سمجھانا چاہا تھا چونکہ علم کثرت کو ہمیشہ وحدت کے ذیل میں جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہذا قدرتی طور پر ابن عربی اس نتیجہ پر پہنچے کہ مظاہر کی بوقلمونی ایک ہی وجود کا حاصل ہے اور ان سب کی اصل ایک ہی وجود ہے۔ لہذا یہ ہے ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصور توحید۔

اس کے برعکس مجدد الف ثانی نے عشق و محبت کی وجہ سے اس عقیدے کو سمجھانا اور حل کرنا چاہا چونکہ عشق و محبت کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک چاہنے والا ہو اور دوسرا وہ جس کو چاہا جائے۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ دونوں الگ الگ ہوں کیونکہ اگر وہ ایک ہو جائیں گے تو محبت کا جوش و خروش باقی نہیں رہتا یہی رجحان اس خیال کا باعث ہوا کہ اللہ اللہ ہے اور بندہ بندہ۔ ایک خالق دوسرا مخلوق ایک غنی دوسرا فقیر۔ ایک بے نیاز دوسرا محتاج۔ دونوں نہ کبھی ایک تھے اور نہ کبھی ایک ہوں گے۔ لہذا یہ ہے ہمہ از اوست یا وحدۃ الشہود کا نظریہ۔

لیکن حقیقت کے جویا افراد کا ایک گروہ اور بھی ہے جن کی قیادت کا فخر شاہ ولی اللہ دہلوی کو حاصل ہے ان کے نزدیک ہمہ اوست اور ہمہ از اوست یعنی وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بے عمل اور خدمت کے لئے خدا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ محبت ہم جنسوں میں ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کائنات کو اصل وجود ہی سے نکلا ہوا مانتے ہیں۔ بیشک ان کے نزدیک خدا ایک ہے اور وہ بے مثال ہے فہم و ادراک سے بالاتر ہے لیکن اس کائنات کا اسی سے صدور ہوا ہے اور ہو رہا ہے یہ کہتے ہیں کہ خدا اور کائنات کا باہمی تعلق ایسا ہی ہے جیسے جسم اور روح کا ہوتا ہے۔ یا زمان و مکان کا جو بظاہر دیکھنے میں الگ الگ ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایک ہے "

وحدۃ الوجود ایک خالص علمی مسئلہ تھا جس کے سمجھنے کے لئے کافی علم درکار تھا۔ جب جاہل متصوفین نے اس کے اظہار و بیان کو اپنا مشغلہ بنا لیا تو انہوں نے اس کی ایسی تعبیریں کیں جو دین و شریعت اور سلوک و معرفت کے بالکل منافی تھیں جس کے نتیجہ میں مشرکانہ خیالات اور غیر اسلامی عقائد رونما ہونے لگے۔

شاہ ولی اللہؒ ابن عربیؒ اور امام ربانیؒ دونوں سے مستفید ہوئے۔ آپ کے نزدیک امام ربانی جس کو وحدۃ الشہود کہتے ہیں۔ وہ خود ابن عربی کے یہاں موجود ہے۔ ابن عربی کے تصور سے جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں امام ربانی نے ان کی اصلاح فرما دی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابن عربی کا تصور وحدت غلط تھا۔ شاہ صاحب کے خیال میں خود ابن عربی بھی کائنات کو خالق کے مرادف نہیں سمجھتے تھے لیکن ان کا کہنا یہ ہے کہ آخر یہ کائنات جس وجود سے نکلی ہے وہ وجود اللہ کے ماسوا کوئی دوسرا وجود تو نہیں ہو سکتا۔ کائنات اور خالق کائنات میں کیا تعلق

باقی ص ۵۲ پر